فلسفہ حدود و قیود اور فلاح انسانیت

ڈاکٹر محمد حماد لکھوی *

تخلیق انسانی کے مقصد اور خالق و مالک کے ساتھ انسان کے تعلق کا بنظر غائر جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کا اس کائنات کے اندر ساری مخلوقات کے مقابلے میں شرف، محض جبر و اختیار سے عبارت اس کے مخصوص مقام کی وجہ سے ہے۔ دو زندگیوں کا تصور اسے اپنے اعمال کے بارے میں خبردار کرتا ہے کہ ہر عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اس کے نتیجہ کو (جو اخروی زندگی میں عنقریب نکلنے والا ہے) مدنظر رکھ کر کیا جائے۔ اور یوں مقصد تخلیق اور خالق سے تعلق کے حوالے سے انسان اپنی آزادی اعمال و افکار کو پابند اور محدود محسوس کرتا ہے۔ انسان محض کائنات کے اندر اپنے منصب اور اپنے مخصوص مقام کی وجہ سے خالق کی طرف سے پابند نہیں کیا گیا بلکہ فطری طور پر بھی انسان اپنی تخلیق اور آغاز زندگی سے لے کر اختتام زندگی تک کے واقعات و معمولات کا جائزہ لے تو واضح ہوگا کہ مشہور مقولہ ''انسان فطرتاً آزاد ہے'' بھی قابل غور ہے۔

مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے کسی بھی حصہ میں پوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو اس دنیا میں آنے کے لیے والدین، گھرانہ، رنگ اور شکل وغیرہ کے انتخاب کا اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ وہ خالصتاً اپنی مرضی کے بغیر کسی جبری قانون کے تحت اس دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر جب وہ بچہ ہوتا ہے تو اس وقت بھی اس کی آزادی پر قدغنیں لگائی جاتی ہیں۔ اگر وہ آگ کی طرف جاتا ہے تو ماں باپ یا دوسرے افراد، جو اس سے عمر میں بڑے ہوتے ہیں، اسے آگ کی طرف جانے سے روک دیتے ہیں۔ اگر وہ کسی کنویں یا گڑھے کی طرف جارہا ہو تو بھی اسے پکڑ کر روک لیا جاتا ہے۔ اگر وہ زمین پر گری پڑی کوئی کوئی چیز اٹھا کر منہ میں ڈالنے کی کوشش کرے تو زبردستی اس کی کوشش ناکام بنادی جاتی ہے۔ غرضیکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنا ''حق آزادی'' استعمال نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ صرف وہی کام کرنے میں آزاد ہوتا ہے جو دوسرے اسے کرنے کی اجازت دیں۔ یعنی

---

* لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

بچپن میں اسے اپنے ''فطری حق آزادی'' کی نعمت عظمیٰ سے متمتع ہونے کا موقع نہیں مل پاتا۔ جب انسان کچھ بڑا ہوتا ہے تو بھی والدین کا محکوم ہوتا ہے۔ اسے ان کی اطاعت بہرحال کرنی پڑتی ہے۔ اطاعت نہیں کرتا تو سزا ملتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ہر کام نہیں کرسکتا جب تک کہ والدین کے طرف سے اجازت حاصل نہ کرلے۔ جب وہ جوان ہوتا ہے تو رسم ورواج، سماجی قوانین اور معاشرتی بندھن اسے خالصتاً اپنی مرضی سے پوری آزادی کے ساتھ اعمال سرانجام نہیں دینے دیتے۔ حکومت کے قوانین اور قواعد وضوابط پر اسے عمل کرنا پڑتا ہے۔ وہ سڑک پر چلتے ہوئے بھی اپنی مرضی نہیں کرسکتا بلکہ اس پر قوانین ٹریفک کی پابندیاں لاگو کردی جاتی ہیں۔ خاندان، معاشرہ اور حکومت میں سے کوئی بھی اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جو چاہے کرے۔ خاندانی اصولوں کی خلاف ورزی، خاندانی مقاطعہ اور بائیکاٹ کا باعث ہوسکتی ہے اور حکومتی قوانین کی خلاف ورزی اسے جیل کی ہوا کھانے پر مجبور کرسکتی ہے۔ گویا زندگی کے اس مرحلے پر بھی وہ اپنی ''فطری آزادی'' کو استعمال کرنے میں آزاد نظر نہیں آتا۔ جب وہ بوڑھا ہوتا ہے تو جوان اولاد اس کی مرضی اور خواہش کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کی بجائے صریحاً نافرمانی پر اتر آتی ہے۔ اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسی میں اپنی فلاح وترقی کا راز سمجھتی ہے۔ بوڑھے کے افکار وخیالات کو پرانے دور کی باتیں سمجھ کر اس کے احکام کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ زندگی کی اس سٹیج پر بھی انسان فطری طور پر خودمختار یا صاحب اختیار وآزادی کہلانے کا حق دار نظر نہیں آتا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی زندگی میں کبھی بھی کلیۃً آزاد نہیں ہوتا۔ اس کی آزادی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ وہ صرف وہ کچھ کرے، دوسرے افراد یا رائج الوقت قوانین جس حد تک اس سے اتفاق کرتے ہوئے اسے کرنے کی اجازت دیں۔ یہ آزادی نہیں بلکہ فطری طور پر دوسروں کی رضا یا قوانین کی مطابقت کی پابندی ہے۔ الغرض انسان پابند اور مقید ہے، فطری طور پر بھی اور معاشرتی طور پر بھی۔ معاشرتی طور پر پابند رہنا فطری عمل ہے۔ لیکن یہ پابندی والدین، رسم ورواج، معاشرہ، حکومت، اولاد اور ملکی واخلاقی قوانین کی وجہ سے ہے۔ جو محض وقتی فائدے اور مصلحت کی خاطر قبول کی جاتی ہے۔ جس کے نتائج دوررس اور ہمیشہ رہنے والے (Everlasting) ہونا

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

ضروری نہیں۔

ان معاشرتی، اخلاقی اور فطری پابندیوں کے علاوہ ایک وہ پابندی اور جبر ہے جو اس کے خالق کی طرف سے دیئے گئے کائناتی اختیار کے سبب انسان پر لاگو ہوتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے انسان مکلّف اور اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ اس تکلیف اور ذمہ داری کی وجہ انسان کا تمام قسم کی وقتی اور موضوعی پابندیوں سے آزاد ہوکر، اپنی مرضی سے اعمال سرانجام دینے کا اختیار ہے۔ یعنی تکلیف اور آزادی واختیار لازم وملزوم ہیں۔ انسان کو اس کا نصب العین بتا کر اس لیے اعمال وافعال میں آزاد رکھا گیا ہے تاکہ وہ اپنے نصب العین سے کامل وابستگی پیدا کرنے کے لیے، اخلاقی داعیے کے طور پر، پوری آزادی کے ساتھ، اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اعمال سرانجام دے۔ ورنہ اگر جبراً اس سے خالق کی مرضی کے مطابق اعمال کروائے جائیں اور اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے کا اختیار ہی چھین لیا جائے تو اس '' تکلیف '' کا پھر کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ مظہر الدین صدیقی انسان کی اس منصبی مجبوری کے لیے نفسیاتی آزادی کی ضرورت کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ارادہ کی تربیت، نفس کی تہذیب اور جذبات پر قابو حاصل کرنے کا عمل خارجی اسباب کے ماتحت ہو تو اس میں وہ اخلاقی شان نہیں پیدا ہوتی ہے جو بلا کسی جبر واکراہ اور بغیر کسی خارجی طاقت کے استعمال کے اپنی آزاد مرضی سے نفس کو قابو یافتہ بنانے سے ظہور میں آتی ہے۔ چنانچہ ارتقائے شخصیت کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ انسان کسی اخلاقی نصب العین کے ساتھ ایسی گہری وابستگی پیدا کرے جو اسے خود بخود بغیر کسی خارجی تربیت وترغیب کے تہذیب نفس اور تربیت جذبات پر قادر اور خواہشات پر حکمران بنادے۔ قانون اخلاق کی اطاعت کے لیے آزادی اور اختیار کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اخلاقی افعال کا اطلاق انہی افعال پر ہوسکتا ہے جو انسان کی اپنی مرضی اور اختیار سے صادر ہوں اور کسی بیرونی طاقت واقتدار کی ماتحتی اور محکوی کا نتیجہ نہ ہوں۔[1]

ایسی پابندی، جس میں دنیوی بنیاد ہائے فرائض وپابندی (Sources of obligations) کا کوئی دخل نہیں ہوتا، محض خالق ومالک کی طرف سے انسان کے مقام اور منصب

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

آدمیت کو اجاگر کرنے کے لیے، تخلیقی مقصد کے طور پر لگائی جاتی ہے۔خدائی پابندیوں کے ضابطوں اور قوانین پر عمل پیرا ہونا دونوں زندگیوں میں کامیابی اور فلاح کی ضمانت قرار پاتا ہے۔یہی وہ ''تشریع اور تکلیف'' ہے جو انسان کو اعمال پوری ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دینے اور نتائج کو مدنظر رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔سید مناظر احسن گیلانی انسان کے ''مقام تکلیف'' اور ضابطہ خداوندی کے اقتضاء کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

''اصل یہ ہے کہ ایک طرف جہاں مذہب نے یہ بتایا ہے کہ آفاق وانفس میں جو کچھ ہے سب خدا کی مخلوق ہے، اور اسی لیے یقین کیا جاتا ہے کہ یہاں کے ہر ذرہ کی حرکت وسکون، خیر وشر براہ راست خالق کی توجہ والتفات کے دست نگر ہیں۔لیکن اسی کے ساتھ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ سلسلہ تخلیق وایجاد یا ظہور اسماء وصفات میں انسان کا کیا مرتبہ ہے۔اور پھر اس لحاظ سے تمام آفاقی کائنات کے مقابلہ میں اس کی فطرت کے اقتضاء اور تقدیر کی کیا نوعیت ہونی چاہیے؟ کہا گیا تھا، اور قرآن کی رو سے کہا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں انسان کا مقام، مقام خلافت ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ سرچشمہ کائنات کے تمام اسماوصفات کا مختلف مدارج کے لحاظ سے اجمالی طور پر جس حقیقت میں ظہور ہوا ہے، اسی کا نام انسان ہے اور وہی تکوین وتخلیق کی آخری ارتقائی شکل ہے۔اب سوچنا چاہیے کہ اس سلسلہ میں جہاں حیات وعلم اور ارادہ وغیرہ صفات الٰہیہ کا ظہور انسان میں ہوا تھا، اسی کے ساتھ کیا اس میں خدا کا وہ کمال نہ اترتا جس کا نام قدرت واختیار ہے۔خدا میں جو کچھ ہے، جب بالا جمال ہی سہی، سب کا عکس انسان میں آگیا ہے (اور خلافت کے یہی تو معنی ہیں) تو انسان اس خدائی کمال کے پرتو سے کیوں محروم رہ سکتا تھا؟ پس انسان بھی اگرچہ خدا کی ایک کن فیکونی مخلوق ہے جس طرح ساری آفاقی کائنات اس کا مخلوق ہے۔لیکن منصب خلافت نے اس کی حقیقت کے اقتضاء اور تقدیر کو اسی صفت اقتدار واختیار کی بناء پر سب سے الگ کردیا ہے۔سب کی تقدیر جبر تھی اور وہی ان میں نمایاں ہے کہ آفاق اور ان کے آثار وخواص وافعال ووظائف کے درمیان میں کہیں انتخاب یا قوت فیصلہ کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔لیکن انسان کی تقدیر یا اس کی حقیقت یعنی خلافت کا اقتضاء اختیار تھا جو تقریباً اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔فطرت انسانی کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اس

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

کوان تمام اعمال وافعال کا ذمہ دار بنادیا ہے جن میں اس کی قوت انتخاب کو کسی نہ کسی حیثیت سے دخل ہو۔ایسے لوگ جوانسانی حقیقت سے اختیار کے عنصر کا انکار کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں خدا کی تقدیر اوراپنی فطرت کے اقتضاء کو جھٹلاتے ہیں۔رعشہ کی جنبش اورارادی حرکت میں فرق نہ کرنے والا دیوانہ ہے۔انسان مجبور ہے یا مختار؟ان دو پہلوؤں میں سے کسی پہلو کی ترجیح یا انتخاب خوداپنی قوت فیصلہ سے،اختیار کا،کیا اقرار نہیں؟واقعہ تو یہ ہے کہ عدالتی قوانین،اخلاقی قوانین بلکہ حکومتوں اور سلطنتوں سب ہی کی بنیاد انسان کے اسی نمایاں امتیاز اور عنصر خاص پر قائم ہے۔ورنہ درختوں،پہاڑوں،جانوروں اور حیوانوں پر فرد جرم لگانے کے لیے عدالت کی کرسی کس نے بچھائی؟بہرحال اپنے اعمال وافعال کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کا انتخاب یا ترجیح،اسی کو اختیار کہتے ہیں اورفطرت انسانی میں اسکا ہونا عقلاً،مشاہدۃً اورشرعاً ثابت ہے۔یہی اس کا اقتضاء ہے اور یہی اس کی تقدیر تھی۔اسی حقیقت کی تعبیر یوں کی جاتی ہے کہ سب کی تقدیر جبر تھی اور ہماری تقدیر اختیار ہے۔لیکن ابھی اس کی تقدیر اور اقتضاء کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔خلافت نے اس میں اختیار پیدا کیا،یہی وہ مقام تھا جس نے انسانی پوزیشن کو نازک ترین منزل پر پہنچادیا۔خلافت یعنی خدا کی نمائندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان اپنے اختیارات کا مالک بن کر کسی دوسرے کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔اوراختیار کا اقتضاء ہے کہ اس کے استعمال صحیح کے لیے علم صحیح سے اس اختیار کا دامن جوڑ دیا جائے۔اوریوں ہرایک انسان اپنے اختیار کی تصحیح کے لیے اپنے ناقص علوم کا نہیں بلکہ خدا کے کامل محیط علم کا محتاج ہوگیا۔ملائکہ کو بھی آفرینش آدم کے موقع پر یہی جواب دیا گیا تھا کہ آدم میں حق تعالیٰ کی شاگردی اور علم حاصل کرنے کی فطری صلاحیت ہے۔یعنی خدا سے علم پا کر وہ یہی جواب دیا گیا تھا کہ آدم میں حق تعالیٰ کی شاگردی اوعلم حاصل کرنے کی فطری صلاحیت ہے۔یعنی خدا سے علم پا کر وہ اپنے اختیار کے استعمال کی تصحیح کرسکتا ہے۔انسانی فطرت کے اسی تعلیمی اقتضاء نے اس قانون کو پیدا کیا جسے ہم تکلیف وتشریع کہتے ہیں۔۔۔۔پھراس تعلیم الٰہی کی صلاحیت پیدا کرنے ہی کا یہ اقتضاء ہوا کہ انسان میں امانت کا جذبہ رکھا جائے جس سے اس میں اس کا احساس پیدا ہو کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں،بلکہ اپنے اعمال وافعال میں اُس کی مرضی کا پابند ہے جس کا یہ امین ہے۔[2]

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

تشریعی اور شرعی حوالے سے قطع نظر اگر محض فطری حوالے سے بھی انسانی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو انسان معاشرے میں کسی بھی جگہ ہر پابندی سے آزاد نظر نہیں آتا۔ بڑے بڑے مفکرین آزادی بھی انسانی فلاح اسی میں سمجھتے ہیں کہ انسان کچھ پابندیاں برداشت کرے۔ بعض اوقات انفرادی مفاد اور فلاح کے لیے اجتماعی آزادی، پابندی کا شکار ہوتی ہے اور بعض اوقات اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر انفرادی آزادی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ کسی دوسرے فرد کی انفرادی آزادی کا تحفظ بھی افراد معاشرہ کی انفرادی آزادی کو محدود کرنے میں ہے۔ بعض اوقات مخصوص حالات کے پیش نظر آزادی کو پابندی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ بنیادان تمام اقدامات کی ایک ہی قرار پاتی ہے کہ انسان کے مفاد میں یہی ہے اور اسی میں اس کی فلاح دنیوی کا راز مضمر ہے۔ سماجی فلسفہ کا مشہور مفکر جے۔ ایس میکنزی (J.S. Machenzie) فلاح انسانیت کی خاطر اس کی آزادی پر لگائی جانے والی پابندیوں کو جائز قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"The liberty that is demanded in an ideal society is sometimes thought of as meaning the complete independence of individuals, except in so for as their liberty interferes with the liberty of others. It was in this way that it was put by Kant, and more recently by Spencer...There may be forms of licence that it is desirable to check, thought they are quite compatible with a similar licence on the part of others .....The Real limitation to freedom is to be found rather in the idea of a common good. Among brothers freedom of action is limited, not merely by the desire not to restricts one another's freedom but by the desire not to interfere with

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

any real good. It would seem that, If there is any reality in the conception of the brotherhood of mankind, a similar limitation must apply, to the larger community as well. Hence it may be doubted whether any satisfactory ground can be given for particular form of liberty, except the ground that the possession of them does more good than harm; in other words, that they are rights that may be expected to carry with them their corresponding obligations. Freedom of speach, for instance, is properly elaimed as a right in a civilized community; because any check upon it would more often hinder the utterence of things that it is well to utter than of things that had better be left unsaid. But this is probably true only when people in general have reached a certain level of self restraint in speech, and even in such a people, there may be circumstances in which it ceases to be true e.g. in a state of war. Even in peace there may be limits to the desirability of complete freedom in this respect.(3)

میکنزی کے خیال میں اصل اہمیت آزادی کو حاصل نہیں بلکہ حقیقی مفاد اور فلاح و بہبود اصل اہمیت کی حامل ہے۔آزادی کا مفہوم یا آزادی کی تحدید کا یہ مفہوم بالکل درست نہیں کہ انسان اس حد تک آزاد ہے، جہاں تک کسی دوسرے انسان کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔اس کی بجائے زیادہ صحیح مفہوم آزادی یہ ہے کہ آزادی کی مطلق یا مقید و محدود ہونا فلاح افراد اوران کے حقیقی مفاد کی دستیابی

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

اورعدم دستیابی پر منحصر ہو۔ یعنی آزادی بجائے خود کوئی مفہوم نہیں رکھتی جب تک وہ فلاح و مفاد کا ذریعہ ثابت نہ ہو۔ اور جہاں آزادی انفرادی یا اجتماعی مفاد و فلاح کی راہ میں رکاوٹ بن جائے تو اسے بہر حال محدود اور پابند بنا دیا جانا چاہیے۔ وہ آزادی کو فلاح و بہبود کے حصول کے ساتھ مشروط کر کے اسے ایک سماجی اصول سمجھتا ہے۔ وہ صرف ایسی مطلق آزادی کے جواز کو درست سمجھتا ہے، جس میں نقصان سے زیادہ بھلائی اور مفاد کی توقع ہو۔ گویا اصل مسئلہ انسان کی آزادی کو ثابت کرنا نہیں بلکہ اس کی سماجی فلاح و بہبود کا حصول ہے۔ آزادی صرف ایسی ہی درست ہوگی جس میں افراد کی انفرادی واجتماعی فلاح کی ضمانت موجود ہو۔ ظاہر ہے افراد معاشرہ اگر ہر پابندی سے آزاد ہوں گے تو ایسے معاشرہ میں فلاح اور حقیقی مفاد کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا افراد معاشرہ کی آزادی پر پابندیاں لگانا اور اس کو محدود کرنا ضروری ہے تا کہ سماجی بھلائی اور معاشرتی انصاف کی فضا میسر آ سکے اور معاشرے کے افراد ایسی فضا کے حصول کے لیے اپنے آپ کو آزاد محسوس کریں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ حقیقی آزادی کی فضا سے پابندیوں اور حدود و قیود کی موجودگی میں ہی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

دی ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار افراد کے اعمال وافعال پر لگائی جانے والی پابندیوں کو حقیقی انسانی آزادی کے لیے ایک نعمت قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں کچھ قواعد وضوابط اور پابندیوں کی عدم موجودگی میں کوئی بھی فرد اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ افراد معاشرہ کے لیے انفرادی واجتماعی طور پر حقیقی فلاح کی منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی بے لگام آزادی کی راہ میں قواعد وضوابط کی رکاوٹیں از خود حائل کرنا لازمی ہے۔ تا کہ دوسرے افراد کے حصول مفاد کے مواقع ضائع ہو جانے کا امکان ختم ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ ایک سکول کی مثال دیتا ہے کہ اگر کسی بڑے سکول کے تمام بچوں کو بیک وقت آزادی دے دی جائے کہ وہ متعلقہ کاؤنٹر سے اپنے لیے دوپہر کا کھانا حاصل کرلیں تو بہت سارے طلبہ کھانا حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔ کیونکہ ایک ہی کاؤنٹر پر ایک ہی وقت میں ہزاروں یا سینکڑوں طلبہ کا اجتماع افراتفری اور ہنگامہ برپا کردے گا۔ اس کی بجائے اگر بچوں کی قطاریں بنادی جائیں اور ہر بچہ اپنی باری پر کھانا حاصل کرے، یعنی تمام بچے اپنی آزادی کو محدود اور کسی ضابطے کا پابند کرلیں تو اصل مقصد کے حصول میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

گی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مطلقاً آزادی پر قطاروں کی پابندی عائد ہو جانے کی صورت میں بہت سارے بچوں کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے۔ اسی طرح وہ سڑک پر گاڑی چلانے کی مثال بھی دیتا ہے کہ ٹریفک کے اشاروں اور ٹریفک کے قوانین پر عمل کرنے سے ہی گاڑی آزادی کے ساتھ چلائی جا سکتی ہے۔ وگرنہ اگر اشاروں اور قوانین کو بے جا پابندیاں سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا جائے تو تمام ڈرائیوروں کی آزادی کا نتیجہ فوری طور پر ہولناک تصادم کی صورت میں نکلے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس آزادی پر کچھ پابندیاں عائد نہ کی گئی ہوں وہ حقیقی آزادی نہیں بلکہ تباہی کا سامان ہے۔ حقیقی آزادی اور اس کا تحفظ، قواعد وضوابط اور حدود و قیود کے تحت ہی میسر آ سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار آزادی کے لیے حدود و قیود کی ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"When we try to make every one do as he pleases, we soon find that no one is free to do much of anything. For example, if all the pupils in a large high school were free to to go directly to ther lunchroom at noon and get their food at the counter, there would be a mad scramble. Most of the boys and girls would get nothing to eat. Instead they restrain themselves by forming lines and taking turns and sometimes by having several different lunch periods. This does not give every one complete freedom, but it does give every one lunch, even if some children have to wait a long time for it..... Nothing could destroy our freedom to drive automobiles more quickly than to make every one free to drive as fast as he pleased and to do away with such restraints as traffic lights. Unless we

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

restrain freedom in many ways, no one can enjoy any freedom at all." (4)

اسی طرح مشہور فرانسیسی مفکر جیک مارٹن (Jecques Maritain) آزادی کو حقوق اور فرائض کے مابین قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حقوق کا تصور ذمہ داری کے تصور کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسان کو اگر فقط انسان ہونے کی وجہ سے آزادی اور کچھ فطری حقوق حاصل ہو جاتے ہیں تو عین اسی وقت اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی لاگو ہو جاتی ہیں۔ حقوق و فرائض کے اس بندھن کو وہ قانون فطرت (Natural Law) قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"There are things which owed to man because of the very fact that he is man. The notion of right and the notion of moral obligation are correlative. They are both founded on the freedom proper to spiritual agents."(5)

اس کے خیال میں انسانی آزادی اور حقوق دراصل اس کی ذمہ داریوں کے ہی سبب ہیں۔ گویا انسان اپنی آزادی اور حقوق کے حصول کے لیے اور ان سے مستفید ہونے کے لیے کچھ ذمہ داریوں کا پابند ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ حقوق، ذمہ داریوں اور قوانین کا سرچشمہ قانون فطرت (Natural Law) ہے۔ گویا قانون فطرت انسان، انسان کے آزادی و اختیار کے فطری استحقاق کو فرائض کی فطری پابندیوں کے تصور سے الگ نہیں ہونے دیتا۔ مارٹن مزید لکھتا ہے۔

"The true philosophy of the rights of the human person is therefore based upon the idea of natural law. The same natural law which lays down our most fundamental duties, and by virtue of which every is binding, is the very law which assigns to us our fundamental rights."(6)

تاریخی طور پر بھی انسان کسی دور میں آزاد نظر نہیں آتا۔ جہالت و تہذیب کے مختلف ادوار

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

مراحل میں سے کوئی مرحلہ اور دور ایسا نہیں کہ انسان اپنے اوپر کسی چیز، شخصیت یا اصولوں کی پابندی محسوس نہ کرتا ہو۔قدیم یونانی تہذیب کے اسطور یاتی دور سے لے کر جدید مغرب کے نام نہاد ''تہذیب یافتہ'' دور تک، انسان ہمیشہ کسی نہ کسی طور خود ساختہ یا الہامی اصولوں کی پابندی کرتا رہا۔ جب اس کو کوئی الہامی رہنمائی یا کسی قائد حقیقی کی رہنمائی میسر نہیں آئی تو اس نے فطری طور پر، خوف اور امید کی بنا پر مختلف چیزوں اور مختلف اعمال کے بارے میں نظریات وعقائد قائم کر لیے۔ پھر مصیبتوں اور خطرات میں گھر جانے کے خوف اور لذت وشادمانی کے حصول کے امید نے اسے انہی عقائد ونظریات کا غلام بنا کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر لی بان ایسی ہی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بعض جاہل قصہ گو لوگوں کا بیان ہے کہ یونانی بالکل آزاد تھے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک عقیدہ کے غلام تھے۔ان کے گرد معتقدات کا ایک دائرہ کھنچا ہوا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ اور کوئی شخص اس عام قومی روش پر نکتہ چینی کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔ بلکہ وہ سب سے بڑھ کر اس کا پرستار بننا چاہتا تھا۔ یونانی دنیا نے مذہبی یا شخصی، غرض کسی قسم کی آزادی کا خواب نہیں دیکھا بلکہ ایتھنز کے قواعد کی رو سے کوئی ملکی آدمی جماعت سے باہر رہ کر زندگی ہی نہیں بسر کرسکتا تھا۔ اسی طرح وطنی عید کے جشن نہ کرنے کا اس کو اختیار حاصل نہ تھا۔قدیم زمانے کی آزادی صرف یہ تھی کہ آدمی اپنے مفتوحہ ممالک کے اصول کا غلام بن جائے۔ اور اسی زمانے میں اگر کسی ملک کے باشندوں کو یہ اجازت دے دی جاتی کہ وہ اپنے خیالات میں آزاد ہو جائیں تو یہ ملک ان جماعتوں کے درمیان، جن میں ہمیشہ جنگ قائم رہتی ہے، ایک دن بھی محفوظ نہ رہے۔''[7]

جب انسان فطری، تاریخی اور نفسیاتی حوالوں سے کسی نہ کسی اصول، نظریئے، عقیدے، شخصیت یا حکومتی قانون کا پابند ہے اور یہ پابندی اس کی پیدائش سے لے کر وفات تک فطری عمل کے طور پر اس کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہے۔تو کیوں نہ ان عارضی، موضوعی اور وقتی مصلحت کی خاطر لگائی گئی پابندیوں کی بجائے اپنے آپ کو ایسے ضابطے اور قانون کا پابند بنالیا جائے جو انسان کے پیدا کرنے والے کا عطا کردہ ہے۔ اور جس میں انسانیت کی فلاح کا

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

رازمضمر ہے۔انسانی آزادی جوزندگی کے تمام مراحل پرکسی نہ کسی فطری یااخلاقی وقانونی مجبوری کے تحت بہرصورت چھن جاتی ہے۔تو کیوں نہ اپنی اس آزادی کو پوری رضا ورغبت اورارادہ وشعور کے ساتھ مالک حقیقی کی رضامندی پرقربان کردیا جائے۔اوراپنے آپ کوخالق و مالک کی مرضی کے تابع کرلیا جائے۔تاکہ انسان انسانوں کی غلامی سے نجات پاکرحقیقی آزادی اورحقیقی فلاح کی منزل کو پاسکے۔جب ماں باپ،رسم ورواج،معاشرہ،اولاداورحکومت کے لیے آزادی کو دل کی خوشی کے ساتھ یابادل ناخواستہ قربان کرناہی پڑتا ہےتو کیوں نہ خالق و مالک کےضوابط واحکام کی خاطر،اپنی آزادی کو دل کی خوشی کے ساتھ قربان کرکے دونوں جہانوں میں سرخروئی اورکامیابی حاصل کی جائے۔اسلام میں حقیقی فلاح کا تصوریہی ہے۔سیداسعدگیلانی اسلام کےتصورکامیابی کے بارے میں یوں اظہارخیال کرتے ہیں۔

''اسلام ایک تصورزندگی ہےاوروہ موجودہ انسانی زندگی کوایک طویل ازلی اورابدی زندگی کاایک مختصرساحصہ قراردیتاہے۔زندگی صورت بدلتی ہےلیکن رواں دواں رہتی ہے۔جس طرح ایک دریاپہاڑکی بلندیوں سے نکلے جہاں وہ نظروں سےاوجھل تھا۔میدانی علاقے میں پہنچ کروہ سب کے سامنے آجائے اورآگے چل کروہ زمین دوز ہوجائے اورپھرکہیں آگے کی وادیوں میں جانکلے۔گویا زندگی ایک دریا ہے جو پہاڑوں میں اوجھل،میدانوں میں نمایاں اورپھرزمین دوز ہوکرنظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔لیکن اس کے وجوداوراس کی حقیقت سےانکارنہیں کیاجاسکتا۔زندگی کے بارے میں اس تصور کے ساتھ اسلام کا تصورکامیابی بھی عام مادی تصورکامیابی اوراس کے ذرائع ووسائل سےمختلف ہے۔اسلام میں کامیابی یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے خالق اوراپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔''[8]

خالق و مالک کی خوشنودی اورمرضی کے تابع کرکے اسلام انسان پرکوئی بے جاپابندیاں عائدنہیں کرتا۔بلکہ اسلام تو انسان کی آزادی کےتحفظ کی خاطراس کےگردرضائے الٰہی کی محفوظ چار دیواری تعمیرکرتا ہے۔تاکہ یہ تمام قسم کے دنیوی واخروی نقصانات سےمحفوظ ہوجائے۔گویا آزادی انسان کی تحدیداسلام نےاس کےاپنے مفادکی خاطرکی ہے۔

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

محمد قطب اسلامی حدود و قیود کو معاشرتی و نفسیاتی حوالے سے انسانی مفاد کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اسلام نے ایک طرف فرد کی خواہشات اور میلانات کا اعتراف کر کے اسے لاشعوری اخفاء (Repression) سے محفوظ کر دیا ہے اور دوسری جانب فرد پر جو بندشیں اور قیود عائد کی ہیں، ان سے مقصود ذوق حکمرانی کی تسکین اور انسانوں کو غلام بنانے کی خواہش کی تکمیل نہیں ہے، بلکہ یہ قیود خود فرد کے مفاد میں ہیں۔ اسلام کی عائد کردہ بندشیں معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت میں بھی فرد کے مفاد میں ہیں، کیونکہ معاشرہ فرد کی ایسی نفسیاتی ضرورت ہے جس سے گریز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اگر معاشرے کی بہتری کے لیے فرد پر کچھ حدود و قیود لگائی جائیں تو وہ بھی فرد کے وجود پر کوئی زیادتی نہیں ہے۔ اس لیے کہ معاشرہ بھی افراد ہی سے مل کر بنتا ہے۔۔۔ اسلام نے جو حدود سماجی بہبود کے لیے فرد پر عائد کی ہیں، بعینہ وہی حدود و قیود خود اس کے وجود کے تحفظ اور اس کی ذاتی فلاح کے لیے بھی لگائی گئی ہیں۔ اس حیثیت سے اسلام میں فرد کے اس مفاد میں جو اس کی ذاتی حیثیت میں ہے، اور اس مفاد میں جو اس کے معاشرے کا ایک جز ہونے کی حیثیت میں ہے، کوئی تعارض نہیں ہے۔ اسلام نے جو بھی بندش عائد کی ہے اس کے دو پہلو ہیں، جو بیک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک پہلو فرد کے مفاد میں ہوتا ہے اور دوسرا پہلو سماج کے مفاد میں ہوتا ہے۔''[9]

اسلام کا تصور کامیابی انتہائی متوازن تصور ہے۔ اس میں نہ تو انسان کو بے جا طور پر پابندیوں میں جکڑا گیا ہے اور نہ افراط و تفریط کی حد تک آزاد رکھا گیا ہے۔ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے۔ اگر چاہے تو خالق کی رضامندی کے اعمال سرانجام دے کر اپنے آپ کو دنیوی و اخروی کامیابی کا مستحق بنا لے اور چاہے تو خالق کی ناراضگی کے کام کر کے دنیا و آخرت کا نقصان اور خسارہ اٹھانے والا بن جائے۔ اس آزادی اعمال میں ایک توازن و اعتدال ہے جو کہ صرف دین اسلام ہی کا خاصہ ہے۔

عبدالقادر عودہ نے اسلام کے اس نظام اعتدال کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ شریعت اسلامیہ، بے قید حریت اور مطلق تقید دونوں طرح کی افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اگر اسلام کچھ

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

پابندیاں عائد کرتا ہے تو ان کا مقصد صرف انسان کو نقصان دہ امور سے باز رکھنا ہوتا ہے۔عودہ لکھتے ہیں:-

"ونظرية الشريعة الاسلامية تجمع بين هاتين النظرتين اللتين تاخذ بهما دول العالم،ذلك ان نظرية الشريعة تجمع بين الحرية والتقييد وهي لا تسلم بالحرية على اطلاقها،ولا بالتقييد على اطلاقه،فالقاعدة الاساسية في الشريعة هي حرية القول،والقيود على هذه الحرية ليست الافيما يمس الاخلاق اوالآداب اوالنظام،والواقع ان هذه القيود قصد منها حماية الاخلاق والآداب والنظام،ولكن هذه الحماية لا تتيسر الا بتقييد حرية القول،فاذا منع القائل من الخصوص فيما يمس هذه الاشياء فقد منع من الاعتداء ولم يحرم من اى حق لان لا عتداء لا يمكن ان يكون حقاً." [10]

اعتدال وتوازن پر مبنی اسلام کا نظریہ حریت دراصل انسان کو نقصان (دنیوی واخروی) سے بچانے کے لیے اور خالق کائنات کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہے۔خالق و مالک کائنات کی رضا مندی ہی حقیقی فلاح کی ضامن ہے۔محمد قطب تحریر کرتے ہیں:-

"خالق کائنات کی جانب رجوع ہی نظریہ اسلامی کا محور ہے اور یہی اسلام کے نظام تربیت کا سرچشمہ اور منبع ہے اور اسی منبع سے تمام قوانین اور ضابطے اور وہ تمام ہدایتیں سامنے آتی ہیں جن کی اساس پر انسانی زندگی مستقیم منہاج پر استوار ہوتی ہے۔اسلام انسان کا رخ اس کے خالق کی جانب کر دیتا ہے اور انسان کو یہ بتا دیتا ہے کہ صرف اللہ سبحانہ ہی ہے جو ہر ایک قوت اور طاقت کا مالک ہے،وہی ہے جو بادشاہ اور سلطان ہے،وہی ہے جو زمین و آسمان کی ہر ہر شے کا مالک ہے۔"بیدہ ملکوت کل شیئی۔" [11] اور انسان جب اس حقیقت سرمدی کے راز کو پالیتا ہے تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔اور اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتا اور اس کا دل اور اس کی روح آزاد ہو جاتے ہیں۔" [12]

نہ انسان کی آزادی کا انکار ممکن ہے اور نہ ہی خالق کائنات کی حاکمیت اعلیٰ کا۔ان دونوں

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

میں تطبیق دیتے ہوئے ایسے وسط زریں تک پہنچا جاسکتا ہے جس کا تعلق انسانی آزادی اور حاکمیت الٰہیہ دونوں کے اقرار کے ساتھ ساتھ انسانی فلاح و بہبود سے ہو۔ بشیر احمد ڈار تحریر کرتے ہیں:۔

''اگر ہم انسانی آزادی کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سامان فراہم نہیں کرنا چاہتے۔ اسی طرح ہم خداوند کریم کے متعینہ ''مقصد'' کے حصول سے عمداً اجتناب یا گریز برتنے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یعنی اگر ہم جناب حضرت باری کی حاکمیت اعلیٰ سے انکار کر بیٹھیں تو ہم ایک ایسی دنیا میں رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جو اخلاقی اعتبار سے بدنظمی، انتشار اور بدامنی کا گہوارہ بن جائے گی اور جہاں خیالات انسانی میں کوئی قابل اعتماد ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث انسان کو روحانی تسکین کبھی میسر نہیں آئے گی۔'' ۱۳؎

یعنی انسان کی حقیقی آزادی کا راز خالق حقیقی کی غلامی میں مضمر ہے۔ اور صرف ایسی آزادی، جو خالق و مالک کی رضامندی اور اس کے دیئے گئے ضابطوں کے مطابق ہو، ہی انسانیت کی فلاح کی ضامن ہو سکتی ہے۔ محمد بخش مسلم، خالق حقیقی کے دیئے گئے انسانی فوز و فلاح کے نظام کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''اسی قانون کے متوازی ایک دوسرا قانون بھی کارفرما ہے۔ اس کا تعلق نظام تکوینی سے نہیں، نظام تشریعی سے ہے۔ 'کیا ہے' سے نہیں 'کیا ہونا چاہیے' سے ہے۔ افعال کی جوابدہی اور اعمال کی ذمہ داری اسی عالم سے متعلق ہیں۔ جزا اور سزا کا صدور اسی قانون سے وابستہ ہے۔ اللہ نے جن طریقوں کو اپنا پسندیدہ فرمادیا ہے، اور حقیقتاً وہ سارے طریقے بندوں ہی کی فوز و فلاح کے ہیں، ان پر چلنے سے مرضیات الٰہی حاصل ہوتی ہیں اور انہی کے آخری اور انتہائی مقام کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت ہے۔ اور اس کے برعکس اللہ کے ناپسند کئے ہوئے طریقوں پر چلنا، اپنی ہلاکت و خسارہ کی راہ اختیار کرنا، مذہب کی زبان میں اللہ کے سخت عذاب کی طرف لے جانا ہے۔ جس کی آخری منزل کا نام جہنم ہے۔'' ۱۴؎

انسان اللہ کی ناراضگی کے کاموں سے بچ کر اپنے اعمال و افعال کے ذریعے اپنے آپ کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنالے تو اسی مقام کو اسلام نے فلاح انسانیت کی اصل منزل قرار دیا

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

ہے۔ارشار باری تعالیٰ ہے۔

وانما توفون اجورکم یوم القیمة فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقدفاز. ۱۵؎

''اور بلا شبہ تمہیں اپنے اعمال کا پورا بدلہ (جزاوسزا) قیامت کے دن ملے گا اور جوکوئی (دوزخ کی) آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا پس تحقیق وہ کامیاب ہوگیا۔''

غلام جیلانی برق ،فلاح وکامیابی کی اس منزل کے تعین کی صورت میں احسان الٰہی کی ممنونیت کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:-

''مذہب سے مراد وہ روحانی دانش اور اخلاقی حکمت ہے جو ابن آدم کو اللہ نے انبیاء کی وساطت سے دی تھی۔انسان دنیا میں کس طرح رہے؟ دوسروں سے اس کے روابط کیسے ہوں؟ مقصد حیات کیا ہو؟ حصول عظمت کے لیے کون سے طریقے استعمال کرے؟ کس چیز کو خیر اور کس کو شر سمجھے؟ اور اپنے خالق و مالک سے کس قسم کے روابط رکھے؟ یہ ہیں وہ مسائل جن پر انسان نے صدیوں سوچا۔اس کے دانشوروں اور فلسفیوں نے مدتوں دماغ لڑایا لیکن وہ کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے بن کہے ہمیں فلاح وعظمت کے تمام راز بتادیے،خیر وشر کی تفصیل سمجھا دی ،منزل کی راہ دکھلا دی اور ہمیں یہ بشارت بھی دی کہ اے لوگو تم میں سے جنہیں اپنی محنت،صلاحیت ،اور پیہم عمل کا یہاں کوئی صلہ نہیں ملا۔خوش ہو جاؤ کہ آگے بھی ایک دنیا ہے جہاں ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔'' ۱۶؎

الیه مرجعکم جمیعا. وعدالله حقا. انه یبدء الخلق ثم یعیده لیجزی الذین امنو اوعملوا الصلحت بالقسط. ۱۷؎

''اسی (اللہ تعالیٰ) کی طرف تم سب نے اکھٹے لوٹ کر جانا ہے۔اللہ کا وعدہ (نہایت) سچا ہے۔بے شک ابتداء تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔وہ پھر وہ عمل تخلیق کا اعادہ (کرتے ہوئے تم سب کو دوبارہ پیدا) کرے گا۔تا کہ مومنوں اور صالح اعمال کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ (اچھا) بدلہ عطا کرے۔''

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

الغرض اعتدال وتوازن پرمبنی اسلام کا تصور آزادی انسان، خالق و مالک کی رضا مندی اور اس کی طرف سے دیئے گئے ضابطے کی مطابقت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی میں انسانیت کی دنیوی واخروی فلاح کی ضمانت میسر آسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

حوالہ جات

۱۔ مظہر الدین صدیقی، اسلام کا نظریہ اخلاق، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، س ن، ص ۱۷، ۱۸

۲۔ الدین القیم، ص ۱۷۴ تا ۱۷۸

3. Mackenzine, J.S, Outlines of social philosophy, George Allen & unwin ltd. London, 1952, P-179-180

4. The World book encyclopedia, Vol. 6, P.2758-2759

5. The rights of man and natural law, P65

6. Ibid, P66

۷۔ لی بان، فسلفہ عروج و زوال اقوام، (ترجمہ عبدالسلام ندوی) تخلیقات لاہور، ۱۹۹۸، ص ۱۵۴

۸۔ اسلامی تہذیب و اقدار، ص ۱۲۷

۹۔ اسلام اور جدید مادی افکار، ص ۱۵۷

۱۰۔ عبدالقادر عودۃ، التشریع الجنائی الاسلامی، دارالکتب العربی بیروت، س ن، ص ۳۵

۱۱۔ القرآن الحکیم، (یسین) ۳۶:۸۳

۱۲۔ اسلام کا نظام تربیت، ص ۲۰

۱۳۔ بشیر احمد ڈار، قرآن کا نظریہ اخلاق، (ترجمہ: عبدالقیوم ہزاروی) اسلامک بک سروس لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۴۷

۱۴۔ محمد بخش مسلم، کتاب الاخلاق، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۸۸

۱۵۔ القرآن الحکیم، (آل عمران) ۳:۱۸۵

۱۶۔ الحاد مغرب اور ہم، ص ۸۱

۱۷۔ القرآن الحکیم، (یونس) ۱۰:۴

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com